اکیسویں صدی کے نسائی ناول پر سماجی اثرات۔ توضیحی مطالعہ

Social Influences on the 21ST Century Feminism Novel:An Explanatory Study

Mohsin Khalid Mohsin
Lecturer, Department of Urdu, Government Shah Hussain Graduate College, Lahore
mohsinkhalid53@gmail.com
Uzma Noreen
Lecturer Department of Urdu, Government Women's University, Sialkot
druzmanoreen@gmail.com
Dr. Syeda Attia Khalid
Assistant Professor, Department of Urdu, Government Women's University, Sialkot
attiyasyeda@gcwus.edu.com

KEYWORDS

Feminism
Women's march
Women Novelists
9/11
Globalization
Expository
Environments
Inspiration

DATES

Received	**11-11-2024**
Accepted	**25-11-2024**
Published	**31-12-2024**

QR CODE

ABSTRACT

While the Urdu novel has fully expressed all the emotions and feelings of life, the specific issues and problems of women have also been openly expressed in this genre. In the 21st century, feminism and feminism are seen as constant themes in all environments. This paper is based on the expository study of social influences in the 21st century feminist novel, in which the concepts and ideas related to feminism are examined through the works of female novelists, which can serve as inspiration for the readers.

DOI:
https://journals.mehkaa.com/index.php/negotiations/authorDashboard/submission/120

تلخیص:

اُردو ناول نے جہاں زندگی کے جملہ جذبات و احساسات کی بھرپور ترجمانی کی ہے وہاں عورتوں کے مخصوص معاملات و مسائل کا بھی کھل کر اس صنف میں اظہار ہوا ہے۔ اکیسویں صدی میں تانیثیت اور ثنائیت ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے جملہ اصناف میں دکھائی دے رہا ہے۔ یہ مقالہ اکیسویں صدی کے نسائی ناول میں سماجی اثرات کے توضیحی مطالعہ پر مبنی ہے جس میں نسائیت سے متصل تصورات و نظریات کا خواتین ناول نگار کی تخلیقات سے محاکمہ پیش کرتا ہے جو قارئین کے لیے مہمیز کا کام دے سکتا ہے۔

اُردو ناول اپنی ڈیڑھ سو برس سے زیادہ عمر پوری کر چکا اور اب بھی اس کے شباب میں خم نہیں آیا ہے۔ اردو ناول کی روایت صدیوں پرانی ہونے کے باوجود اپنے اندر توانائی اور جدت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر سموئے ہوئے ہے۔ ناول کی صنف کا یہ اختصاص ہے کہ اس میں انسانی زیست کے جملہ عناصر کو پیش کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔

اکیسویں صدی میں اردو ناول نے موضوعات کے حوالے سے پیش رفت دکھائی ہے اور اس کی حدود میں عالمگیریت کے پھیلے وسیع و عریض جہانوں سے متصل باسیوں کے رجحانات و میلانات کا ایک گنج ہائے گراں مایہ پنہاں ہے جس سے سابقہ، موجودہ اور آئندہ نسلیں استفادہ کرتی رہیں گی۔

اردو ناول میں ہر طرح کے تصورات کے بیان کی گنجائش موجود ہے۔ ناول ایک ایسی صنف ہے جس میں داستان اور افسانے کی نسبت زیادہ وسیع زیادہ مؤثر اور زیادہ وضاحت سے واقعات کو بیان کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ ایک اچھا ناول ضخیم ہوتا ہے ۔ناول اگر چار پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے تبھی اس کے تمام تقاضے پورے ہوتے ہیں۔ سو صفحے کا ناولٹ ہو سکتا ہے یا ناولا لیکن ناول بہر حال نہیں ہو سکتا۔ ناول کے لیے ضخامت کوئی نقص نہیں بلکہ اس کا فنی حُسن اور واقعات کے تسلسل کا اعجاز ہے۔

اردو ادب کی جملہ اصناف میں جس صنف نے سب سے زیادہ ترقی کی ہے وہ بلاشبہ اردو ناول ہے۔ ناول میں بظاہر ایک کہانی اور اسے متصل کرداروں کے طویل واقعات ہوتے ہیں جو ایک منطقی ترتیب کے ساتھ پے در پے آتے جاتے ہیں اور کہانی کے تسلسل کو رواں رکھتے ہوئے اختتام تک قاری کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کیے رہتے ہیں۔ یہ وصف افسانے اور داستان میں بھی ہے لیکن داستان اور افسانے کی فضا اور کینوس کچھ اور اختصاص کا تقاضا کرتا ہے۔

سماج کیا ہے اور سماج کا انسانوں پر کس طرح کا اثر پڑتا ہے۔ یہ ایک طول الطویل بحث ہے جس پر مشرق و مغرب میں بہت لکھا گیا ہے اور اس کی تعین اور تحدید کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے اس کے باوجود سماج کی تعریف کا تعین اور اس کے عناصر ترکیبی کو منظم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سماج انسانوں کے بنائے ہوئے معاشرے کی پل پل بدلتی صورتحال کے رجحانات کا عملی مرقع ہے جسے ایک بار تشکیل دینے سے اس کی منطقی ترتیب کو جامد نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ایک اصولِ قطعی ہے اور اس سے انحراف ممکن نہیں۔ سماج میں ہر دن نئی تبدیلیاں اور بدلاؤ آتے رہتے ہیں اور تبدیلی کا یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔

سماج معاشرے کا متبادل لفظ ہے جس کے معنی باہم مل کر رہنے کے ہیں۔ عمرانیات کے نقطہ نظر سے معاشرے اور سماج سے مراد ایک مخصوص اصطلاح ہے جس میں نسل انسانی کی بقا کا انحصار باہم ایک ہو کر رہنے میں ہے۔ سماج دراصل انسانی خیالات و تصورات کے اجتماع کا نام ہے جہاں ہر قسم کی طرزِ زیست کا عملی مظاہرہ ممکن ہوتا ہے۔ سماج میں ایک جیسے خیالات اور نظریات رکھنے والے لوگ موجود ہوتے ہیں جن کی اساس سماجی تقاضوں کی عمل داری کی یکتائی میں پنہاں ہوتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے۔ سماج میں رہنے کی وجہ سے یہ انسان بنا ہے اور انسانی تقاضوں کو میٹ کر سکا ہے۔ معاشرہ اور سماج دراصل انسانوں سے مل کر بنتا ہے۔ کچھ انسان باہم ایک جگہ بود و باش اختیار کرنے اور زندگی کے شب و روز گزارنے کا ارادہ کر لیتے ہیں اور پھر کچھ اصول باہم طے کر لیتے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر وقت گزارنا اور ایک دوسرے کے لیے مدد و معاونت کی فضا کو قائم رکھنا سہل ہو جاتا ہے۔ اس طرح نسل در نسل انسان سماج کی تحدید میں خود کو مقید رکھ کر زندگی گزارنے پر قانع رہتے ہیں اور سماجی اثرات کو قلب و روح سے محسوس کرتے ہیں۔

سماج چوں کہ انسانوں کے اجتماع اور باہمی مشاورت سے تشکیل کردہ بیانیے سے استوار ہوتا ہے اس لیے سماج کے انسانوں پر اور انسانوں کے سماج پر براہ راست اثرات مرتب ہوتے ہیں جس سے سماج اور انسان بہ یک وقت مستفید ہوتے ہیں اور انحراف کی صورت میں تخریب کے نتائج کے ذمہ دار بھی۔ امامہ ریاست لکھتی ہیں:

> "سماج انسان کو حیوانیت سے نکال کر انسانیت میں لاتا ہے اور یہ عمل تربیت کے ذریعے ہوتا ہے۔ ایسی جگہ جہاں انسان اپنے جسم و جان کی حفاظت کے لیے اور اپنی نسل کی بقا کے لیے اقدامات کرے اسے سماج کہا جاتا ہے۔ اسی سماج کا تانا بانا انسانوں کی باہمی سماجی ضروریات و احساسات سے استوار ہوتا ہے جس کی پابندی دونوں پر بہ یک وقت لازم ہوتی ہے"۔(1)

کیا انسان معاشرے کے بغیر اور سماجی تحدید کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے اور ایک مثالی زندگی گزار سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب نہیں میں ہے۔ انسانوں نے ہزاروں برس جنگلوں اور ویرانوں میں گزارے ہیں۔ اس نے پتھر کے دور میں خود کو ہر طرح کے مصائب اور جان سے گزرنے والی مشکلات اور مہمات سے جوجھ کر دیکھا۔

انسان نے آخر یہی فیصلہ کیا کہ ہم انسان جانوروں سے مختلف ہیں اور ہماری زندگی اور شب و روز مختلف ہیں اس لیے ہمیں جانوروں سے مختلف رہنا ہے اور ان کو اپنے تابع کر کے استعمال میں لانا ہے اور یہ کام ہمارے اجتماع اور اتحاد کے بغیر ممکن نہیں۔ اس احساس نے انسانوں کو سماج کی تشکیل کرنے اور اس کے اصول و ضوابط کو متعین کرنے میں مدد فراہم کی۔ تب سے اب تک انسان سماج میں رہتا ہے اور سماج کے اصول و ضوابط پر سختی سے عمل پیرا ہے۔

سماج کس طرح انسانوں پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کی اثر انگیزی کس حد تک انسانی سوچ اور بیانیے کو متاثر کرتی ہے۔ اس بات کا اندازہ ان عوامل سے لگایا جا سکتا ہے:

- معاشرے میں جتنی آبادی زیادہ ہو گی اسی قدر معاشرہ ارتقائی منازل طے کرے گا۔
- صنعت و حرفت کی ترقی بھی سماج کی ساجھے داری پر منحصر ہے۔
- رسمی تعلیمی اداروں کی کثرت عام تعلیم کے تصور کو فروغ دے گی جس کا اثر انسانوں کے تعقل میں شعور کی بجھی چنگاری کو بھڑکانے کا سبب بنے گا۔
- مواصلاتی نظام کی آسائش کا انحصار سماجی ارتقا کے آپسی لین دین پر منحصر ہے یعنی انسان جس قدر باہم منظرم اور مربود ہوں گے اسی قدر ان کے درمیان تعلق کی نوعیت اور احساس کی شدت زیادہ ہو گی۔
- سماجی تقاضوں کے توازن کو برقرار رکھنا انسانوں کی ذمہ داری ہے۔ توازن میں عدم کی صورتحال سماج کے تنزل کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔

انسان جب سے پیدا ہوا ہے تب سے اس نے اپنے لیے ہر وہ چیز حاصل کرنے کی کوشش کی ہے جس میں اسے قلبی تسکین اور نفسی اطمینان مل سکے۔ انسان کو دوسرے انسان سے متعارف ہونے کی ضرورت ہمیشہ لاحق رہتی ہے۔ انسان کوئی ربوٹ اور کمپیوٹر چیٹ جی بی ٹی ڈیوائس نہیں کہ جسے کسی کے حکم کی تعمیل کے لیے ہمہ وقت حکم کا پابند رہنا پڑتا ہے۔

یہ ایک ذی روح ذی حیات ہے۔ اس کے شب و روز میں ایک فطری تفاوت موجود ہے اور یہ دنیا اختلاف باہمی کا نام ہے۔ یہاں ہر چیز دوسرے کے لیے امتحان ہے۔ مچھلی بڑی مچھلی کو کھا جاتی ہے اور اس سے بڑی اس سے بڑی کو اپنا شکار بناتی ہے۔ یہاں ادلے کا بدلہ ہے اور سینہ جھپٹی بھی ہے، ظلم بھی ہے اور انصاف بھی ہے۔ بھوک بھی ہے اور سیری بھی ہے۔ یہ دنیا اختلاف رائے کے جہانِ دراز کا پھیلا ہوا وسیع نظام ہے جس میں انسان باہم رہتے ہوئے دست و گریبان اور قلب و روح میں سمائے ہوئے رہتے ہیں۔ یہ سماج اسی عناصر و عوامل اور جدت و کہنہ روی کا نام ہے۔ پروفیسر ممتاز حسین لکھتے ہیں:

> " تاریخ سے قبل کے ادوار میں بھی سماج کے بنیادی عناصر کا تھوڑا بہت تعارف ضرور تھا۔ انسان بولتا، سوچتا، گاتا، رقص کرتا، نقش و نگار بناتا اور پتھر اور لکڑی کے ٹکڑوں کو اپنے استعمال میں لاتا تھا۔ یہ اپنے خیالات و جذبات کو حروف یا علامتوں کے ذریعے واضح کرتا تھا۔ اس فطری عنصر نے اس میں تحرک کا جذبہ پیدا کیا تب سے انسان نے حرفوں سے آگے بڑھ کر گفتگو تک کا سفر بظاہر صدیوں میں طے کیا لیکن یہ ارتقا سماج میں باہم پیوستہ رہ کر ممکن نہ تھا۔"(2)

سماج میں انسانوں کی باہمی لین دین کی روش سماج کے اصولوں کو وضع کرتی ہے۔ انسان شروع دن سے دوسرے انسان کا محتاج رہا ہے۔ انسان کی تخلیق کا سارا عمل دوسرے انسانوں کی مدد پر انحصار کرتا ہے۔ انسان کے بچے کو نو ماہ پیٹ میں رہنے کے بعد جنم دیتے ہوئے بھیڑ بکریوں کی طرح ماں کے آگے نہیں ڈالا جاتا جو چند گھنٹوں میں کھانے پینے اور دوڑنے پھرنے لگ جاتا ہے بلکہ اسے

پانچ سال تک سخت قسم کی نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ماں کے پیٹ سے جنمے شیر خوار کی اتنی سکت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے جسم پر بیٹھی مکھی اُڑا سکے۔ یہ سماج ہی ہے جو ایک نومولود کو پال پوس کر توانا اور چھتنار بنا دیتا ہے۔ خالد علوی لکھتے ہیں:

"انسان فطری طور پر سماج پسند واقع ہوا ہے۔ اسی فطری تقاضے اور خارجی ماحول کی ضرورت نے اسے اجتماعی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا"۔(3)

انسان اپنے ہم جنسوں اور ہم جولیوں میں رہنا پسند کرتا ہے اور اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرتے ہوئے خوشی اور طمانیت محسوس کرتا ہے۔ انسان دوسرے انسان کا ساتھ ہے۔ اسے اپنے علاوہ دوسرے انسانوں سے ایک فطری لگاؤ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان پہلے اپنے بارے میں سوچتا ہے اور پھر اپنے قرب و جوار کے بارے میں۔ انسان انسانوں کی ضرورت ہے اور سماج اس ضرورت کو ایک اکائی کی وحدت میں پروئے رکھتا ہے۔ یوں سماج کے ارتقا کا عمل جاری رہتا ہے اور انسان سماج پر اثر انداز ہوئے بغیر اس کے اجتماعی تشخص سے متاثر ہوتا ہے۔ امامہ ریاست لکھتی ہیں:

"اپنے ہم جنسوں کے ساتھ رہنے کی خواہش نے سماج کی ضرورت کو جنم دیا۔ انسان نے اپنی اجتماعی زندگی کو زیادہ منظم اور مربوط بنانے کے لیے سماج کو پابندیوں اور ضابطوں سے استوار کیا۔ یہ عمل مرورِ وقت کے ساتھ جاری رہا۔ آج ہم جس سماج میں رہ رہے ہیں یہ انسانوں کا بنایا ہوا ہے اور اس میں انسان بستے ہیں۔"(4)

انسان نے جنگلوں سے نکل کر آبادیوں میں رہنا شروع کیا تو باہم رواداری و ایثار کے جذبات بھی سوا ہوئے۔ انسان بظاہر ایک قنوطی مزاج لے کر پیدا ہوا لیکن فرحت و مسرت کے داعیات اس کی فطرت میں قدرت نے ودیعت کیے ہیں۔ یہ انھیں فطری داعیات کا اثر ہے کہ انسان خوشی و مسرت اور انبساط کا ماحول بنا کر اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرتا ہے۔ انسان عجب مخلوق ہے۔ یہ اپنے سوا دوسروں سے توقعات وابستہ کرتا ہے اور پھر ان توقعات کے پورا نہ ہونے کا ماتم کرتا ہے، روتا ہے، چیختا ہے اور بے وفا کہتا ہے۔ یہ جملہ مظاہر اس کی شخصیت کے فطری عناصر کا تقاضا ہیں جن کی ادائیگی سماج کے بغیر ممکن نہیں۔

انسان نے جب بولنا شروع کیا تو بولتا چلا گیا اور جب لکھنا شروع کیا تو پھر لکھتا چلا گیا اس کے باوجود بہت کچھ ایسا ہے جسے لکھا نہیں گیا اور بہت کچھ وہ بھی ہے جو ابھی اسے درپیش نہیں ہوا۔ ایک عجیب سی کسک ہے جو اسے لکھنے، بولنے اور اظہار کرنے پر اکساتی رہتی ہے۔ شاہد حسین رزاقی لکھتے ہیں:

"پہیے کی ایجاد نے انسانی بساط کو مریخ تک پہنچا دیا۔ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس کا دعویٰ بھی کرتا ہے۔ یہ اپنے علاوہ دوسرے انسانوں سے وہ خواہشات وابستہ کرتا ہے جو دوسرے اس کے لیے کبھی مہیا نہیں کر سکتے۔ معاشرہ انسانوں کی جملہ عادات و رسوم و رواج اور تہذیبی و سماجی و لسانی تغیرات سے مل کر بنتا ہے۔ سماج مختلف کرداروں کا جم غفیر ہے جہاں انسان اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کو اپنے لیے

جینا مرنا اور معیار و انتخاب سمجھتا ہے۔ زندگی اسی آمیزش اور تغیرات کے باہم ادغام کا نام ہے جس سے سماج کی تشکیل ہوتی ہے اور انسان ارتقا کی منازل طے کرتا ہوا آگے ہی آگے بڑھتا جاتا ہے"(5)

کسی بھی زبان کے سرمائے کو اُٹھا کر دیکھ لیجیے اس میں زیادہ تر مواد انسانوں کے جذبات و احساسات کے جملہ اظہار پر مبنی ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانوں نے جب سے اس کرہ پر قدم رکھا، خود کو کھوجنے اور اس کرے کے پنہاں رموز کو دریافت میں اپنی توانائی اور کمالِ فن کے سبھی تلازموں کو آزمایا اور شکست وریخت کے مسلسل عمل سے خود کو گزارا اور حاصل و یاس کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ زبان اظہار کا معتبر ذریعہ ہے۔ اس ذریعہ اظہار سے انسان اپنے ارد گرد کے ماحول، معاشرت، سماج، اور سماجی اثرات کو قبول کرتا ہے اور اس سے انحراف بھی کرتا ہے۔

اردو ناول میں سماج کے اس دوہرے معیار کو بہترین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ناول ایک ایسا طرزِ اظہار ہے جس میں انسانوں کی جملہ زیست کے مظاہر کی ترجمانی ملتی ہے۔ انسان ہنستا بولتا، چلتا، کھاتا پیتا اور روتا ہے اور یہ سب اس کی جذباتی زندگی کی رواں آبشاریں ہیں جن کی پھواریں لفظوں کی چھاگلوں میں مقید کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان چھاگلوں کو اصطلاح میں ناول، ڈراما، افسانہ کہہ لیجیے کہ اس میں جو چیز مقید ہو گئی وہ پھر اپنے معیار اور اعتبار کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر گئی۔

اردو ناول نے انسانوں کے سماج پر اثرات اور سماج کے انسانوں کی زندگی پر اثرات کو خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے ناول مراۃ العروس کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈپٹی صاحب نے سماج کی معنویت اور اس کے جبر کو کس طرح اکبری اور اصغری کے کرداروں کی صورت بیان کیا ہے۔ سماج کے جبر کو ناول کے وسیع پھیلے ہوئے افق کو کسی ٹیلی سکوپ سے دیکھنے کی ضرورت نہیں بلکہ سر کی آنکھ سے اس جبر کو دیکھا جا سکتا ہے۔

انگریزوں کی معاشرت نے صدیوں کے پروردہ ہندوستانی سماج کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ بدیسی بولی نے مقامی پراکرتوں کے پرخچے اُڑا دیئے اور مقامی سماج کے جملہ مظاہر کو بدیسی بو باس نے گہنا دیا۔ یہ سماج کی طاقت ہے اور سماجی طاقت کے جبر کا اظہار ہے جسے مراۃ العروس میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"ساس نے کہا، بیٹا! اس کا کچھ خیال مت کرو۔ ابھی کم سن ہے، بال بچے ہوں گے، گھر کا بوجھ پڑے گا، مزاج خود بخود درست ہو جائے گا۔ اور آخر اچھے لوگ بروں سے بھی نباہ دیتے ہیں۔ بیٹا! تم کو خدا نے سب لائق کیا ہے، ایسی بات نہ ہو کہ لوگ ہنسیں، آخر تمہاری ناموس ہے۔"(6)

اردو ناول پر سماجی اثرات کی شدت کا غلبہ 1857 کے بعد بھی جاری رہا۔ تقسیم ہند کا سانحہ ایسا تھا کہ جس نے ہر نوع اور ہر بیانیے کو بدل کر رکھ دیا۔ جمے جمائے ہوئے سماج کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ اس نقشے کی غارت گری نے لکھنے والوں کے اوسان بھی خطا کر دیئے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ دو آزاد ریاستوں نے اپنے اپنے بیانیے تشکیل دیئے اور سماج کے بنائے ہوئے اصولوں اور حد بندیوں سے پوری طرح انحراف کیا۔ یہ صورت حال ستر کی دہائی تک اسی طرح جاری رہی۔

سماج کے بدلتے ہوئے منظر نامے کو خواتین ناول نگاروں نے خوبصورت انداز میں لکھا۔ ان خواتین میں قرۃ العین حیدر، جمیلہ ہاشمی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، جیلانی بانو، واجدہ تبسم، ذکیہ مشہدی، حجاب امتیاز علی، لطف النسا بیگم وغیرہ کے ہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

ستر کی دہائی کے بعد بیسویں صدی کے اختتام تک خواتین ناول نگاروں نے جس طرح سماج کے ٹوٹتے بکھرتے منظر نامے کو اپنے ناولوں میں پیش کیا وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قرۃ العین کا "آگ کا دریا" ایک مکمل سماجی انحطاط کی داستان لیے ہوئے ہے۔ بانو قدسیہ کا ناول "حاصل گھاٹ" کو سماج کے ناسور کرداروں اور سماجی انحطاط کے تنزل آمیز رجحان کی نمائندگی کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ الطاف فاطمہ کا ناول "چلتا مسافر" سماج کی اُس تصویر کو پیش کرتا ہے جسے دیکھ کر گھن آتی ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے سماج میں کیا ہو رہا ہے اور کس طرح کا بیانیہ تشکیل پا گیا ہے کہ نفسا نفسی کے اس دور میں متحوس زدہ چہرے سماج کے کہنہ مشق اصول پر ور روایات کے ساتھ اس طرح کا کھلواڑ کر رہے ہیں اور کوئی ان کا بازو پکڑنے والا نہیں ہے۔

سلمیٰ یاسمین کا ناول "سانجھ بئی چو دیس" کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ پوٹھوہار کی زمین اپنے سماج کے باسیوں پر تنگ کر دی گئی ہے اور کوئی جبروت قسم کی دیہی معاشرت ہے جس میں نسائی جذبات سے مملو نسائیت زدہ ذہنوں کو معمولی گستاخی کے عوض دیوار میں چُن دینے کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ امامہ ریاست لکھتی ہیں:

> "مراۃ العروس سے لے کر جراتِ رندانہ تک ہر ناول میں عورت کی کہانی موجود ہے اور عورت کو سماج کے ہاتھوں خوار ہوتے دکھایا گیا ہے۔ سماج کے جبر نے جس طرح عورت کا استحصال کیا ہے یہ ان ناولوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ عورت کو ماں، بہن، بیٹی کے روپ میں دیکھنے والے اسے شب گزاری کے لیے طوائف، رنڈی، قحبہ گر کہنے سے باز نہیں آتے۔ سماج کے جبر کے آگے ان عورتوں کے دوپٹے ہوا میں لہراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اے آر خاتون، رضیہ بٹ، عصمت، بانو، قرۃ العین کی تحاریر پڑھ کر وحشت ہوتی ہے کہ کس طرح سماج کے نام پر اور معاشرتی جبر کے تحت عورتوں کی عصمتوں کے جنازے نکالے گئے اور انھیں سرِ بازار رسوا کرنے کی کوئی کسر باقی نہ چھوڑی گئی"۔(7)

اکیسویں صدی کا منظر نامہ کچھ اسی طرح ہے کہ اس پر بیسویں صدی کے سماجی انحطاط کا شدید غلبہ دکھائی دیتا ہے۔ اکیسویں صدی میں اردو ناول اور ہمارا سماج عجیب و غریب صورت میں ڈھل گیا ہے۔ اس دور میں قلم اٹھانے سے پہلے اپنے اندر جھانکنے کی ضرورت وحشت سی طاری کر دیتی ہے کہ آخر کیا لکھا جائے اور کیا نہ لکھا جائے۔ ڈپٹی نذیر احمد سے شروع ہونے والی اردو ناول کی روایت نے اکیسویں صدی تک آتے آتے اتنے بیانیے اور کینڈے تبدیل کیے اور کس کس طرح کا سماجی دباؤ قبول کیا ہے یہ سب پڑھنے اور سوچنے سے تعلق رکھتا ہے اور اس پر سینکڑوں ناولوں میں ناول نویسوں نے بھرپور انداز میں لکھا ہے۔ رانا صابر علی لکھتے ہیں:

> "اکیسویں صدی میں جس طرح تبدیلیاں تیزی سے رونما ہوئیں، پاکستانی حکومت اور سیاست نے جس طرح پلٹا کھایا اور عالمگیر اثرات نے جس طرح ہماری اکانوی کو دبوچا ہے یہ سب وطن عزیز کے بیانیے کو

متاثر کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ پاکستان کے سماج کی جو صورتحال آج ہے اس طرح کی ہنگامی حالت ستر اور نوے کی دہائی میں بھی نہ تھی۔ بیرونی سطح پر ہل چل مچانے والی مناقشات نے پاکستان کے اندرونی معاملات میں بڑی کھلبلی مچائی ہے اور تھرڈ ورلڈ کو کووڈ 19 نے وہ مار ماری ہے کہ اب سماج کا تانا بانا بکھر گیا ہے اور معیشت دیوالیہ ہو گئی اور ہر چیز کا معیار منہ کے بل گر پڑا ہے۔"(8)

آج ہم اکیسویں صدی میں سانس لے رہے ہیں اور یہ صدی گزشتہ ادوار کی نسبت اپنے اندر زیادہ ہیجان، تیزی اور افراتفری لیے ہوئے ہے۔ یہ صدی سائنس، ٹیکنالوجی اور چیٹ جی پی ٹی کی صدی ہے۔ اس صدی کو "مصنوعی ذہانت" کی صدی بھی قرار دیا جا رہا ہے۔ اس صدی کے ربع اوّل میں سامنے آنے والے خواتین ناول نگاروں کے ناولوں میں ان محرکات کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے جس سے یہ تاثر لیا جا سکتا ہے کہ اس صدی کے انسانوں پر سماج کے جبر کا دہرا اثر ہو گا اور انسان اپنی انفرادی شناخت کو برقرار رکھنے کے لیے پہلے کی نسبت زیادہ متحرک، فعال اور زبردست کاوش کا کردار ادا کرے گا۔ محمد منظر حسین لکھتے ہیں:

"اردو ناول اکیسویں صدی میں داخل ہونے کے باوجود نذیر احمد دہلوی کے بنائے راستے پر گامزن دکھائی دیتا ہے۔ یہ صدی سائنس اور ٹیکنالوجی کی صدی ہے اس میں موبائل، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ٹیلی ویژن کا دور دورہ ہے۔ سائنس کے حیرت انگیز انکشافات نے انسان کو ورطہ حیرت میں ڈال رکھا ہے۔ ایسے میں انسان کیا لکھے گا اور سماج آزاد پسند کہلائے گا جب ہر چیز کی معلومات انٹرنیٹ پر دستیاب ہو گی"۔(9)

اس میں کوئی شک نہیں کہ اکیسویں صدی میں معاشرتی جبر کا سلسلہ قدرے رک گیا ہے اور اب مرد لکھاریوں کے ساتھ ساتھ خواتین فکشن نگار بھی اپنی مرضی سے ممنوعہ موضوعات کا انتخاب کرتی ہیں اور جو جس طرح لکھنا چاہتی ہیں لکھ رہی ہیں اور چھپ بھی رہی ہیں لیکن ایک تاثر جو ہمیشہ سے اردو ناول کے ساتھ مملو نظر آتا ہے وہ یہ کہ اردو ناول کو سماج کے خود ساختہ اصولوں اور نسائیت کے قاتل پردہ پوشوں کو منکشف کرنے کی جرات ہنوز سامنے نہیں آ سکی۔ فاطمہ حسن لکھتی ہیں:

"اکیسویں صدی کی پاکستانی خواتین قلم کار زیادہ تر انسانی تعلقات سے گندھی ہوئی کہانیوں کا انتخاب کرتی ہیں۔ وہ رشتوں، ناتوں، باہمی روابط، معصوم جذبوں اور جبر و گھٹن کے رد عمل کو سامنے لانے میں قدرے ہچکچا رہی ہیں۔ انھیں چاہیے کہ کہ مغرب نواز جاگیر دارانہ نظام کے خلاف آواز اُٹھائیں اور روایتی اخلاقیات کا درس دینے کی بجائے حقیقت کو منکشف کرنے کی کوشش کریں تاکہ عورت پر سماج کے جبر کو کم کیا جا سکے اور ان کی عصری حسیت کی تفہیم میں ان کی نسائی کوششوں کا ثمر مل سکے"۔(10)

اکیسویں صدی کے نسائی ناول میں ممنوعہ موضوعات پر بات کرتے ہوئے بہت کچھ کہنے سے احتراز برتا جاتا ہے اور یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ پاکستانی سماج میں کچھ روایات اور اقدار ایسی ہیں جس میں بدلاؤ ہمہ وقتی ہے اور اس کے مہلک اثرات عام انسانوں پر مرتب ہو سکتے ہیں۔

پدر سری سماج کے اس مصنوعی بیانیے میں اب کوئی جان دکھائی نہیں دیتی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ خواتین فکشن نگار خانگی مسائل کے المیے اور رونے دھونے کو موقوف کریں اور اس بیانیے کے خلاف کھل کر تحریر کے ذریعے اپنا احتجاج سامنے لائیں تاکہ ان کے افسانوں، ناولوں میں تراشے ہوئی نسوانی کرداروں کی مدد سے پاکستانی عورت کو اپنے حقوق کے حصول میں مدد مل سکے۔ زاہدہ حنا لکھتی ہیں:

> "اردو کے متعدد ادیبوں نے زوال آمادہ جاگیر داری نظام کے سائے میں پنپنے والے پدر سری نظام کو جہاں نئی معنویت عطا کی وہیں خواتین ادیبوں نے اس کے خلاف اعلانِ بغاوت بھی کیا۔ برصغیر کی مسلمان عورت کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کر کے اس کے شعور پر مصلحت و سمجھوتے کی کاری ضرب لگانے والوں نے یہ نہیں سوچا کہ یہ عورت اب قدامت پسندی کی زنجیروں میں پڑی سسکتی نہیں رہے گی بلکہ بہت جلد سماج کے خلاف بغاوت کرے گی اور پدر سری خاندان کی چولیں ہلا کر رکھ دے گی۔"(11)

اکیسویں صدی میں درجن سے زائد نسائی ناول سامنے آئے ہیں جن میں الطاف فاطمہ کا "چلتا مسافر"، بانو قدسیہ کا "راہ رواں"، بشری رحمان کا "کس موڑ پر ملے"، سلمی اعوان کا "لہو رنگ فلسطین"، نیلم احمد بشیر کا "طاؤس فقط رنگ" اور آمنہ مفتی کا "جرات رندانہ" قابلِ ذکر ہیں۔

"طاؤس فقط رنگ" میں متنوع رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ نیلم احمد بشیر نے اس ناول میں امریکہ کی زندگی کی خوبصورتی کو قلم بند کیا ہے۔ مذکورہ ناول میں امریکی اور پاکستانی تہذیب کا تقابل و موازنہ، امریکہ میں مقیم پاکستانیوں کے روزمرہ کے شب و روز کی داستان کو بیان کیا ہے۔ اس ناول میں عالمی سطح پر درپیش مسائل کی بھی خوب عکاسی کی گئی ہے۔ اس ناول میں سیاسی، سماجی، ازدواجی، دہشت گردی اور جنگ ایسے اہم ترین اور پیچیدہ موضوعات کو زیر تحریر لانے کی کامیاب نسائی کاوش ہے۔ ناول کا پلاٹ مربوط ہے اور واقعات نویسی جامع انداز میں ملتی ہے۔ نیلم احمد بشیر نے اپنی پوری چابکدستی سے امریکہ میں قیام پذیر پاکستانیوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی حقیقی تصویر کشی کی ہے:

> "مسز چین اپنے شوہر کی محبت میں مبتلا ہے اور جب ڈیلا ئلہ اسے دوبارہ گیانا کی آبادیوں میں لے جاتی ہے تو اس کی آنکھیں پرانی یادوں کے موتی پرونے لگتی ہیں"۔(12)

نیلم احمد بشیر نے امریکی معاشرے کی گمراہیوں، ناجائز تعلقات، سماجی بے حسی اور نوجوانوں کے نفسیاتی مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ مصنفہ نے ڈیلا ئلہ کے ذریعے انسانی نفسیات کی کشمکش احساس محرومی کو بیان کیا ہے۔ رومانیت کے عوامل بھی ناول میں موجود ہیں جو نفسیاتی طریقے سے ابھرتے ہیں۔ نعیم بیگ لکھتے ہیں:

> "نیلم احمد بشیر کے فن کے بارے میں ایک بات ضرور کروں گا کہ نیلم کو لکھتے ہوئے حقیقی زندگی کے کسی سراب یا روحانی طلسم کدے کی ضرورت نہیں نہ ہی وہ کسی سہارے کی ضرورت محسوس کرتی ہے۔ اس

> کے لیے حقیقت کا فریب ہی اس قدر جاذب نظر ہے کہ وہ کسی اور سمت نہیں دیکھتی۔وہ اس چکا چوند روشنی میں بھی پوری تازگی بشاشت کے ساتھ لہجے کی سلاست و فصاحت کو لے کر آگے بڑھتی ہیں جو بنیادی اور ٹھوس زندہ حقیقتوں کی عکاس بن جاتی ہے"(12)

نیلم احمد بشیر نے اس ناول میں نسوانی کرداروں کے ذریعے عورت کے مختلف روپ بہروپ ہمارے سامنے عیاں کیے ہیں۔ جس میں تمام روپ اپنا اپنا کردار نبھاتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہمیں عورت کا ایک روپ ڈیلائلہ کے کردار میں نظر آتا ہے جو ایک حسد کرنے والی بے باک اور مفاد پرست لڑکی ہے۔عورت کا یہ انداز بہت بھیانک ہے۔ایک روپ قمر النساء،چین اور سجیلا کے کرداروں میں نظر آتا ہے جو بہت حد تک وفادار اور بے لوث محبت کرنے والی خواتین ہیں۔

ایک طرف مراد کی بیوی شمع کا کردار ہے جو اپنے شریک حیات سے بے وفائی کرنا چاہتی ہے تو کہیں ہمیں شیری کے کردار میں ایک بہادر،باہمت،فیاض اور دانشمند لڑکی نظر آتی ہے۔اس کے علاوہ مسٹر چین، عقل بیگ،اسفند اور کنول وغیرہ شامل ہیں جو اپنے اپنے حصے کا کردار اپنے مخصوص ماحول اور کلچر کی نمائندگی کرتے ہوئے بخوبی سرانجام دیتے نظر آتے ہیں۔۔ناول میں سماج کے بدلتے رنگ بھی خوب نظر آتے ہیں۔ مختلف اقوام تہذیب،مذہب اور معاشرت کے نام پر توڑ پھوڑ کا شکار ہیں اس لحاظ سے ناول سماجی اور نفسیاتی اغراض کے لحاظ سے اپنی اہمیت بر قرار رکھے ہوئے ہے۔ اس ناول میں احسن طریق سے سماجی و معاشرتی حقائق کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔

> "کالے پروں والا پرندہ اسے نہ جانے کہاں کہاں ساتھ لیے اڑا لے چلا جا رہا تھا اسے لگا وہ کسی ہوا کے غبارے پر سوار ہے اور غبارا اونچی اونچی اڑانیں بڑھتا ہوا خوبصورت وادیوں اور دریاؤں کے اوپر سے گزرتا چلا جا رہا ہے"۔(13)

اپنی تخلیقی قوت کے حوالے سے نیلم احمد بشیر یوں رقمطراز ہیں:"میرے اندر ازل سے کہانی اور زندگی ساتھ ساتھ دھڑکتی بھڑکتی رہتی ہے۔جو کچھ بیتا،جھیلا،دیکھا،برتا اور محسوس کیا ناول میں کہہ دینے کی کوشش کی۔"(14)

ان ناولوں میں نسائی وجود کی بازگشت کے ساتھ ساتھ سماج کے نسائیت پر منفی اثرات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ سماج ہر زمانے کی پروردہ کلاس سسٹم کو متاثر کرتا ہے۔پاکستانی معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ یہاں ہر قسم کی طبقاتی تقسیم کے باوجود عورتوں کو دوسرے درجے کی مخلوق گردانا جاتا ہے اور ان پر ظلم و جبر کی ہر ممکنہ کوشش کو سراہا جاتا ہے۔

خواتین ناول نگاروں نے جہاں عمومی طور پر پاکستان سماج کے منفی پہلوؤں کو واضح کرنا ہے وہیں اپنے وجود کی بقا کے لیے بھی انھیں سخت تنقیدی اور ناقدانہ رویہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ان کی تحریر میں سختی،کرختگی اور کھردرا پن اس لیے آتا ہے کہ انھوں نے سماج کے دباؤ کو سہا ہوتا ہے اور صدیوں سے طبقاتی نظام کی اس بے رحم چکی میں پسنے والی حوا کی جائی نے حوصلہ پست ہونے کے باوجود نسائی آواز کو دبنے سے روکا اور ڈھال بن کر حائل رہی۔

اکیسویں صدی کے اردو ناول میں نسائی وجود کی بازگشت برابر سنائی دیتی ہیں اور ایک حلقہ ایسا وجود میں آیا ہے جنھوں نے اپنے حقوق کے حصول کے لیے عملی جدوجہد کا آغاز کر رکھا ہے۔ ان خواتین فکشن نگاروں نے نسائیت کے جملہ تقاضوں کو اپنی تحاریر کے ذریعے پدر سری نظام اور طبقاتی یورشوں کے آگے پُل باندھنے کے لیے اپنے آہنی ارادوں میں سمجھوتے کی کیل نکال کر باہر پھینک دی ہے۔ عصرِ حاضر کی خواتین فکشن نگاروں کی تخلیقات کے مطالعہ سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ موجودہ صدی کا اردو ناول نسائی ناول کے نام سے جانا جائے گا۔

حوالہ جات

1. امامہ ریاست، پاکستانی اردو ناول پر سماجی اثرات، غیر مطبوعہ مقالہ، پی ایچ ڈی (نوشہرہ: نادرن یونی ورسٹی، نوشہرہ، 2023ء)، 23۔
2. ممتاز حسین، پروفیسر، ادب اور شعور (کراچی: ادارہ نقد ادب، 1992ء)، 189۔
3. خالد علوی، اسلام کا معاشرتی نظام (لاہور: المکتبہ، 1991ء)، 81۔
4. امامہ ریاست، پاکستانی اردو ناول پر سماجی اثرات، 23۔
5. شاہد حسین رزاقی، پاکستانی مسلمانوں کے رسوم و رواج (لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، 1965ء)، 34۔
6. نذیر احمد دہلوی، ڈپٹی، مراۃ العروس (دہلی: کتابی دنیا، 2003ء)، 28۔
7. امامہ ریاست، پاکستانی اردو ناول پر سماجی اثرات، 24۔
8. رانا صابر علی، پاکستانی اردو ناولوں میں سیاسی اور سماجی شعور، غیر مطبوعہ مقالہ (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، 2015ء)، 293۔
9. محمد منظر حسین، اکیسویں صدی میں اردو ناول اور ہمارا معاشرہ، مشمولہ مضمون، اشتراک، 14 فروری 2021
10. فاطمہ حسن، آصف فرخی، ڈاکٹر، مرتبین، خاموشی کی آواز، مشمولہ مضمون، خاموشی کی آواز، 21۔
11. زاہدہ حنا، اردو ادب اور پدر سری نظام، مشمولہ خاموشی کی آواز، 21۔
12. نیلم احمد بشیر، طاؤس فقط رنگ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2017ء)، 202۔
13. نعیم بیگ، ایک روزہ تبصرہ، سنگ میل پبلشرز، 30۔
14. نیلم احمد بشیر، طاؤس فقط رنگ، 135۔

References in Roman Script

1. Imama riasat, Paksitani Urdu Novel per Samaji Asraat, Ghair matboa maqla, Ph.d, (Nowshara: Northern university,2023), 23.
2. Mumtaz Hussain, Prof, Adab aur Shaor,(Karachi: Adara Naqd-e- Adab ,1992),189.
3. Khalid Alvi, Islam ka Moashrti Nazam (Lahore: al-Maktba, 1991), 81.
4. Imam Riasat ,Paksitani Urdu novel per samaji asraat,p:23
5. Shahid Hussain Razaqi, Pakistani Muslmano ke Rasom-o-Ravaj (Lahore: Adra Saqaqafet-e-Islamia, 1965), 34.
6. Nazeer Ahmed, Dehlvi, Deputy, Mirat-ul-Aroos (Dehli: Kitabi dunya, 2003),28.
7. Imam Riasat, Paksitani Urdu novel per Samaji Asraat, 24.
8. Rana Sabir Ali, Paksitani Urdu Novelon main Siasi aur Samaji shaor, Ghair Matboa, Maqala, (Islamabad: AIOU, 2015), 293.
9. Muhammad Manazar Husaain, 21st main Urdu Novel aur Hamara Moshara, Mashmola: mazmon, ishtraaq,14 Feb,2021.
10. Fatima Hassan, Asif Farkhi, Dr, Murtebeen, Khamoshi ki Awaz, Mashmola, Mazmon, Khamoshi ki awaz, 21.
11. Zahia Hina, Urdu Adab aur Pidar Sari Sazam, Mashmola, Khamoshi ki Awaz,21.
12. Neelam Ahmed Bashir, Taous Faqat Rang (Lahore: Sang-e-Meel Publication, 2017), 202.
13. Naeem Baig, Aik Roza Tabsra (Lahore: Sang-e-Meel Publication, 2008),30.
14. Neelam Ahmed Bashir, Taous Faqat Rang, 135.